ACADEMIA International Journal for Social Sciences
Volume 4, Issue 3, 2025 ISSN-L (Online): 3006-6638

Historical Connections between South Asia and Anatolia and the Intellectual Convergence of Akif and Iqbal

برصغیر و اناطولیہ کے باہمی تاریخی رشتے اور عاکف و اقبال کا فکری اشتراک

Dr. Hafiz Aamir Ali
aamirali643768@gmail.com
https://orcid.org/0000-0002-8861-8635
PhD, Selcuk University, Konya- Türkiye
Corresponding Author: * Dr. Hafiz Aamir Ali aamirali643768@gmail.com

Received: 12-06-2025 **Revised:** 18-07-2025 **Accepted:** 02-08-2025 **Published:** 22-08-2025

ABSTRACT

This article offers a comprehensive analytical study of the historical, intellectual, cultural, and spiritual relations between the Muslims of South Asia and Anatolia, reflecting a long-standing and multifaceted connection between these two great regions. The introduction draws on historical references to demonstrate how the mutual interactions among Arab, Turkish, and Indian civilizations gave rise to a unique Islamic civilization characterized by rich scholarly, commercial, and Sufi dimensions. It then explores the relations between the Seljuks of Rum, the Abbasid Caliphate, and the Delhi Sultanate, illustrated through official decrees, gifts, sermons, and other symbols issued by the Caliph. The core of the article focuses on the intellectual contributions and roles of two eminent poet-thinkers, Mehmet Akif Ersoy and Allama Muhammad Iqbal, during a time when the Muslim world was engulfed in decline, foreign domination, and intellectual confusion. Both figures urged their nations to rise beyond mere lamentation or nostalgia for the past, and instead embrace paths grounded in knowledge, unity, selfhood, wisdom, religious consciousness, and moral values. They critically examined both the positive and negative aspects of Western civilization and encouraged their people to harmonize with modernity while remaining rooted in their own cultural and religious traditions.

Keywords: *South Asia, Anatolia, Akif, Iqbal, History and Though*

یہ مقالہ برصغیر اور اناطولیہ کے مسلمانوں کے مابین تاریخی، فکری، تہذیبی اور روحانی روابط کا ایک جامع تجزیاتی مطالعہ ہے، جو ان دونوں عظیم خطوں کے درمیان ایک دیرینہ اور ہمہ گیر تعلق کی عکاسی کرتا ہے۔ ابتدا میں تاریخی حوالوں سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح عرب، ترک، اور ہندوستانی تہذیبوں کے باہمی روابط نے ایک منفرد اسلامی تمدن کو جنم دیا، جس میں علمی، تجارتی اور صوفیانہ پہلو گہرائی سے جُڑے ہوئے تھے۔ بعد ازاں سلاجقہ روم، عباسی خلافت اور دہلی سلطنت کے باہمی تعلقات کو خلیفہ کی طرف سے دیے جانے والے منشورات، تحائف، خطبات، اور دیگر علامات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کا مرکزی حصہ دو نمایاں مفکر شعراء، مہمت عاکف ایرسوئے اور علامہ محمد اقبال کی فکری خدمات اور ان کے اس دور میں کردار پر مرکوز ہے جب مسلم دنیا شدید زوال، بیرونی تسلط، اور فکری انتشار کا شکار تھی۔ دونوں نے اپنی قوموں کو محض شکایت یا ماضی پرستی سے نکال کر علم، اتحاد، خودی، حکمت، دینی شعور اور اخلاقی اقدار کی بنیاد پر نئی راہیں دکھائیں۔ انہوں نے مغربی تہذیب کے مثبت و منفی پہلوؤں کا تجزیہ کیا اور اپنی اقوام کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اپنی تہذیب و دین سے جڑے رہنے کی دعوت دی۔

کلیدی کلمات: برصغیر، اناطولیہ، عاکف، اقبال ، تاریخ و فکر

تعارف:

برصغیر اور اناطولیہ ایسے دو عظیم خطے ہیں جو جغرافیائی تنوع کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں بھی کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ صدیوں پر محیط اسلامی تاریخ میں ان دونوں علاقوں نے علمی، روحانی، تمدنی اور سیاسی میدانوں میں نہ صرف نمایاں خدمات انجام دیں بلکہ باہم فکری و تہذیبی تبادلے کے ذریعے ایک منفرد تمدنی ہم آہنگی کو جنم دیا۔ عرب، ترک اور ہندوستانی اقوام کے درمیان قائم تعلقات نے مشترکہ اسلامی شناخت، دینی شعور، صوفیانہ روایت اور فکری بصیرت کو فروغ دیا، جس کا اثر آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی تعلق کی معنویت کو مزید واضح کرنے کے لیے زیر نظر مقالہ مہمت عاکف

ایرسوئے اور علامہ محمد اقبال جیسے دو ممتاز مفکرین کی فکری میراث کے تناظر میں برصغیر و اناطولیہ کے باہمی رشتے کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے۔

1- تاریخی رشتوں کا پس منظر

خطہ برصغیر اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت، جغرافیہ، موسم، سماجی و مذہبی حالات، مصالحہ جات، کھانے، پھل اور اپنے باسیوں کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی دنیا کے منظر نامہ پر اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھے ہوئے ہے۔ زمانہ وسطی کی اکثر اسلامی تاریخی کتب بعض افسانوی روایات پر انحصار کرتی ہوئی آدم و حوا کا اسی خطہ ہند میں جنت سے زمین پر اترنے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ (طبری، ابن جریر، تاریخ الامم و الملوک، ج1، ص 84-85، اردو ترجمہ صدیق ہاشمی، نفیس اکیڈمی کراچی، 2004) ابو الفضل نے بہترین اور طویل انداز میں اس خطہ کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ اس کے الفاظ میں "یہ خطہ ایک دریا کے مانند ہے، یہ ایک میدان ہے جو بہت کشادہ ہے۔۔۔ یہ اپنی آب و ہوا تناسب اور مزاجوں کے اعتدال کی بنا پر بے نظیر ہے۔ باوجود اتنی وسعت کے ہر جگہ آباد ہے۔ کوئی منزل یا کوئی کوس ایسا ختم نہوں ہوتا جس میں آباد قصبات اور دیہات نہ ہوں اور میٹھے پانی کی نہریں نہ بہہ رہی ہوں۔" (علامی، ابوالفضل، آئین اکبری، اردو ترجمہ مولوی محمد فدا علی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور 2015، دوم، صفحہ 8-9)

جس طرح ہندوستان کے لیے مختلف ادوار میں کئی افسانوی اور روحانی روایتیں منسوب کی جاتی رہی ہیں، اسی طرح ترک اقوام سے متعلق بھی قرونِ وسطیٰ کی عربی اور اسلامی مصادر میں حیرت انگیز، معنویت سے بھرپور اور بعض اوقات اساطیری رنگ لیے ہوئے بیانات بکثرت ملتے ہیں۔ ان میں ترکوں کی جنگی صلاحیت، قومی نظم و ضبط اور مستقبل کے عالمی منظرنامے پر ان کے اثرات کا اشاریہ ملتا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ترکوں سے تعرض نہ کرنا جب تک وہ تم سے تعرض نہ کریں، کیونکہ میری امت کی خلافت وسلطنت اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو سب سے پہلے چھیننے والے بنو قنطورا ہوں گے۔" (سیلمان بن احمد الطبرانی، المعجم الکبیر، مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، جلد 10، ص 181، حدیث 10389) اسی مفہوم کی ایک اور روایت حضرت پیغمبر ﷺ سے یوں منقول ہے: "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم ترکوں سے جنگ نہ کر لو، جن کے چہرے سرخ، ناکیں چپٹی، آنکھیں چھوٹی اور چہرے کمان کی مانند ہوں گے۔" (محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری، مکتبہ سلطانیہ، مصر، 1311ھ، جلد 4، ص 43، حدیث 2928) اسی موضوع پر ہمارے استادِ محترم، ڈاکٹر علی دادان نے اپنی تحقیقی تصنیف قدیم عربوں کے مطابق اتراک میں، اور زکریا کتباچی نے اتراک کیسے مسلمان ہوئے؟ میں ان روایات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اگرچہ بعض جدید محققین ان روایات کو اساطیری اور ثقافتی ساخت کا حامل قرار دیتے ہیں، لیکن ان کی موجودگی خود اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ ترک اقوام اسلامی ذہن میں ایک ممتاز، قابلِ ذکر اور مخصوص شناخت رکھتی تھیں۔ وہ نہ صرف بہادر اور جنگجو سمجھے جاتے تھے، بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلق کو سیاسی حکمت و بصیرت کا ایک تقاضا تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترکوں کا تذکرہ صرف اسلامی مصادر میں ہی نہیں، بلکہ مسیحی اور یہودی ادبیات و تواریخ میں بھی اسی سے ملتے جلتے ہوئے مفاہیم میں ملتا ہے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کی بعض متون میں ترک اقوام کو "خدا کے مخالفین پر عذاب نازل کرنے والے لشکر" کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ (رے، جوناتھن، "مغرب اور مشرق کے درمیان آئبیرین، جلد 18، 2009، ص 44-65، علی، حافظ عامر، 16ویں صدی میں "یہودی: سولہویں صدی کے بحیرہ روم میں یہودی آباد کاری عثمانیوں اور مغلوں کا غیر مسلم رعایا کے ساتھ تعلقات کا تقابلی جائز،غیر مطبوعہ، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ 2023، ص 206-61) خلاصہ یہ ہے کہ اگر عرب اسلامی مصادر میں ہندوستان اور ترک اقوام سے متعلق بیانات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے، تو واضح ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف ہندوستان کو انسانی تاریخ میں سب سے قدیم تہذیبی مرکز اور آباد سرزمین کے طور پر پیش کیا گیا ہے، وہیں ترک اقوام کو جنگی نظم و ضبط، ریاستی صلاحیت، اور عالمی اثر پذیری کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں خطے اس بات کا واضح مظہر بنتے ہیں کہ ان کے درمیان تعلقات کی جڑیں محض سیاسی نہیں بلکہ تہذیبی، فکری اور روحانی سطح پر بھی گہرائی رکھتی ہیں۔

2- اسلام کے بعد برصغیر و ترک اقوام کا پہلا تعامل

اسلام کی سرحدِ عرب سے باہر اشاعت کے ساتھ ہی برصغیر اور ترک اقوام کی تاریخ میں چند ایسے مستقل نوعیت کے تغیرات رونما ہوئے جو نہ صرف تہذیبی و مذہبی سطح پر اہم تھے بلکہ طویل المیعاد سیاسی و فکری اثرات کے حامل بھی ثابت ہوئے۔ یہ ایک قابل توجہ حقیقت ہے کہ باوجود جغرافیائی فاصلے اور فطری تفاوت کے، ان دونوں خطوں کے درمیان تاریخی و فکری مماثلتیں رفتہ رفتہ گہری ہوتی گئیں — اور متعدد معاملات میں ایک دوسرے کے تجربات کی پیروی کی جانے لگی۔ ان دونوں اقوام کا عرب افواج سے اولین براہ راست سامنا خلافتِ راشدہ کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کے دور میں، ساسانی سلطنت کے آخری ایام میں ہوا، جب ساسانیوں نے عرب افواج کے خلاف ترک اور سندھ کے حکمرانوں سے عسکری مدد طلب کی۔ (ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، ج 2، ص 444، 459) یہ رابطہ محدود پیمانے پر اور صرف حکومتی یا فوجی نمائندوں کی سطح پر تھا — عوامی سطح پر نہیں۔ عربوں اور برصغیر و ترک اقوام کے مابین بڑے پیمانے پر باقاعدہ تعامل اموی دور میں سامنے آیا، جب عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو ہندوستان اور قتیبہ بن مسلم کو ماوراء النہر کے ترک علاقوں کی فتوحات پر روانہ کیا۔ اس مرحلے پر برصغیر اور ترک اقوام کے ساتھ مسلم رابطے کے تابناک اور متحرک ادوار کا آغاز ہوا جو کئی

صدیوں تک جاری رہا۔ گیارہویں صدی ان دونوں خطوں کے لیے ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ ایک جانب ترک اقوام اناطولیہ کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں تو دوسری جانب سلطان محمود غزنوی ہندوستان کی طرف فتوحات کے ارادے سے گامزن تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ برصغیر اور اناطولیہ کی سمت میں مسلم ترکوں کی توجہ کو بیک وقت جس شخصیت نے مرتکز کیا، وہ محمود غزنوی ہی تھے۔ 1040ء کی جنگِ دندانقان، جو سلجوقیوں اور غزنویوں کے مابین خراسان میں لڑی گئی، اسلامی دنیا میں ترک اقتدار کی سمت متعین کرنے والا ایک فیصلہ کن معرکہ تھا۔ اس جنگ میں سلجوقی افواج نے سلطان مسعود غزنوی کو شدید شکست سے دوچار کیا۔ اس واقعے کے چشم دید گواہ اور درباری مورخ ابو الفضل بیہقی اپنی معروف تصنیف تاریخِ بیہقی میں لکھتا ہے: "سلطان مسعود جنگ سے اس قدر خوف زدہ ہو کر بھاگا کہ میں خود بھی انیس دن بعد اس سے غزنہ میں جا کر ملا۔" (بیہقی، تاریخِ بیہقی) اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شکست کے بعد سلطان نے فوری طور پر غزنہ کا رخ کیا، جہاں اس نے وقتی طور پر پناہ لی۔ بعد ازاں وہ ہرات گیا، اور پھر وہاں سے سندھ کی جانب روانہ ہوا، جو اس کے لیے آخری جائے پناہ ثابت ہوئی۔ مشہور ہندوستانی مؤرخ محمد قاسم فرشتہ اپنی کتاب تاریخِ فرشتہ میں لکھتا ہے کہ سلطان مسعود سندھ کے ایک قلعے میں محصور ہو گیا تھا، اور وہیں قتل کر دیا گیا: "مسعود کو سندھ کے ایک قلعے میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔" (فرشتہ، محمد قاسم، ترجمہ: عبدالحی خواجہ، تاریخِ فرشتہ، المیزان ناشران، لاہور، 2008، ج 1، ص 107) یوں جنگِ دندانقان نہ صرف غزنوی اقتدار کے زوال کی ابتدا ثابت ہوئی، بلکہ اس کے نتیجے میں وسط ایشیاء اور خراسان میں سلجوقی ترکوں کا غلبہ اور برصغیر و اناطولیہ کی طرف مختلف ترک قبائل متحرک پیش قدمی بھی تیز ہو گئی۔

3- سلجوقی، عباسی اور دہلی سلطنت کے باہمی تعلقات

بارہویں صدی کے آغاز تک، ترک اقوام نے نہ صرف اناطولیہ بلکہ برصغیر کے وسیع زرعی اور شہری علاقوں پر مستحکم سیاسی اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اگرچہ یہ حکمرانی بنیادی طور پر عسکری قوت کی بدولت حاصل ہوئی، لیکن اسے شرعی اور عوامی جواز دلوانے کے لیے حکمران طبقے نے عباسی خلافت سے رسمی منظوری کو ناگزیر سمجھا۔ حالانکہ اس دور میں خود عباسی خلفاء بنو بویہ اور دیگر طاقتور خاندانوں کے زیرِ اثر تھے اور سیاسی اعتبار سے انتہائی محدود حیثیت رکھتے تھے۔ اس تعلق کی تاریخی اور فکری وضاحت کرتے ہوئے اوزدمیر لکھتے ہیں کہ: "عباسی خلفاء اور سلجوقی سلاطین کے مابین جو تعلق قائم ہوا، وہ سیاسی ضرورت، دینی جواز، اور عالمِ اسلام میں خلافت کے باقی ماندہ اثر کو ایک رسمی مظہر کی صورت میں محفوظ رکھنے کا ذریعہ تھا۔" (اوزدمیر، ایم-این، "عباسی خلفاء اور سلاجقہ عظام کے درمیان تعلقات"، سلجوق یونیورسٹی جرنل آف ٹرکش اسٹڈیز، شمارہ 24، 2008، ص 315–368) اسی تسلسل میں، ابن الاثیر 435ھ/1043ء کے واقعات بیان کرتے ہوئے وضاحت کرتا ہے کہ عباسی خلیفہ نے سلجوقی سلطان طغرل بیگ کے پاس قاضی القضاۃ ابوالحسن الماوردی کو بطور سفیر روانہ کیا۔ ابن الاثیر کے مطابق، سلطان طغرل بیگ نے خلیفہ کے نمائندے کی عزت و تکریم کے لیے چار فرسخ کے فاصلے تک بنفسِ نفیس استقبال کیا، جو خلافتِ عباسیہ سے اس کی گہری وفاداری اور روحانی عقیدت کا عملی اظہار تھا۔ الماوردی نے واپسی پر اپنی رپورٹ میں خلیفہ کو اس امر سے آگاہ کیا کہ طغرل بیگ خلیفہ کے احکام کی مکمل اطاعت اور خلافت سے ہر حال میں وفاداری کو لازم سمجھتا ہے۔ (ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، بیروت: دارالکتب العلمیہ، 1998، ج 8، ص 47) اناطولیہ میں سلجوقی حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کو شرعی اعتبار سے عباسی خلافت کی منظوری سے مشروط تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف خطباتِ جمعہ میں خلیفہ کا نام لیا جاتا، بلکہ شیخ الشیوخِ روم جیسے اعلیٰ مذہبی مناصب بھی خلافتِ عباسیہ کی اجازت سے تفویض کیے جاتے۔ (بیرام، میکائیل، آخی اوران اور مولانا کی چپقلش، سماجی اور سیاسی تناظر، نیو کلچر مرکز، قونیہ، 2012، ص 245–246) سلجوقی سلاطین کی جانب سے خلافت کو باقاعدگی سے تحائف، مالِ غنیمت، غلام اور کنیزیں روانہ کی جاتی تھیں، جو نہ صرف ایک سیاسی وفاداری کی علامت تھی بلکہ خلافت سے روحانی برکت حاصل کرنے کا ذریعہ بھی سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً: سلطان قلچ ارسلان ثانی نے 572ھ/1176ء میں مریوکیفالون کی فتح کے بعد خلافتِ عباسیہ کو اطلاع دینے کے لیے غلام بغداد روانہ کیے۔ (ابن بیبی، تاریخ سلاجقہ روم، انقرہ، 1996، ص 283) سلطان رکن الدین سلیمان شاہ نے عباسی خلیفہ کو 10 حسین کنیزیں اور 10 خوش شکل غلام بطور نذرانہ بھیجے۔ (میخائل، ایس- پی (1944)۔ سریانی پٹیریارک میخائل کی تواریخ (1042-1195)۔ غیر مطبوعہ نسخہ از ترک تاریخ ادارہ۔) سلطان علاء الدین کیقباد نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے توسط سے خلافت کو قیمتی تحائف روانہ کیے، جن کا تفصیلی ذکر ابن بیبی نے کیا ہے۔ (ابن بیبی، 1996، ص 257) فروری 1212ء میں عباسی خلیفہ نے سلطان عزیز الدین کیکاوس کو باضابطہ منشورِ حکومت ارسال کیا، جس کے ساتھ چند نادر ہندوستانی تحائف بھی پیش کیے گئے۔ (عثمان طُران، سلاجقہ کے عہد کا ترکی، اوتکین ناشرات، استنبول، ص 298) ان تمام تاریخی شواہد سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ اگرچہ ترک حکمران عسکری لحاظ سے خودمختار تھے، مگر عباسی خلافت کی تائید اور منظوری کو وہ اپنے اقتدار کے لیے شرعی، سیاسی اور عوامی جواز کا ناگزیر حصہ سمجھتے تھے۔

برصغیر میں جب مسلمان ترک سلاطین نے دہلی میں اپنی حکومت قائم کی، تو انہوں نے خلافتِ عباسیہ کے ساتھ تعلق کو صرف روحانی و دینی نہیں، بلکہ سیاسی جواز کا بھی ذریعہ بنایا۔ دہلی سلطنت کے بانی، ترک النسل غلام قطب الدین ایبک نے جب 1206ء میں غور کے حکمرانوں سے اقتدار سنبھالا، تو اگرچہ اس نے باضابطہ خلافت سے منشور حاصل نہ کیا، تاہم وہ اپنے لیے "امیر المؤمنین کا مددگار" اور "خلافت کا دستِ راست" جیسے القابات استعمال کرتا رہا — جو خلافتِ عباسیہ سے وابستگی اور وفاداری کا صریح اظہار تھے۔ (نظامی، تاریخ سلطنت دہلی، 1387ھ، ص 35) عباسی خلافت سے دہلی سلطنت کا پہلا رسمی اور

باضابطہ تعلق ایبک کے داماد اور جانشین شمس الدین التتمش کے دور میں قائم ہوا۔ اگرچہ اُس وقت خود خلافتِ عباسیہ اندرونی کمزوریوں، سیاسی انتشار اور بیرونی دباؤ کا شکار تھی، تاہم التتمش نے خلافت سے منشور حاصل کر کے اپنی حکومت کو مذہبی و سیاسی حیثیت میں جواز فراہم کیا۔ یوں وہ برصغیر کا پہلا سلطان قرار پایا جسے خلافتِ عباسیہ کی طرف سے باقاعدہ تائید و توثیق حاصل ہوئی۔ (شاہ، اسلام کا نظامِ خلافت، 1345ھ، ص 94) تاریخی روایت کے مطابق، 22 ربیع الاول 626ھ / 20 مارچ 1229ء کو عباسی خلیفہ کے نمائندہ قاضی جلال الدین عروس دہلی پہنچے اور منشور خلافت سلطان التتمش کو پیش کیا۔ اس موقع پر دہلی شہر میں جشن کا سماں تھا، اور دربار میں قیمتی تحائف، خیرمقدمی تقریبات، اور شاہانہ پذیرائی کی گئی۔ اس منظر کا عینی شاہد — بعد کا سلطان دہلی غیاث الدین بلبن — اس دن کی یاد کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: "جب سلطان شمس الدین کو منشور ملا، تو وہ اس قدر شاد و فرحاں تھا، گویا اپنی سلطنت کا نصف حصہ قاضی جلال الدین عروس کے حوالے کر دے گا۔" (برنی، تاریخ فیروز شاہی، مترجم سید معین الحق، اردو بورڈ 1991، ص 181–182) تغلق خاندان کے دور میں دہلی سلطنت اور خلافتِ عباسیہ کے تعلقات اپنے عروج کو پہنچے۔ غیاث الدین تغلق نے اپنے سکے پر "امیر المؤمنین کا مددگار" کندہ کروا کر خلافت سے عقیدت اور وابستگی ظاہر کی۔ (نظامی، 1387ھ، ص 35) اس کے بعد محمد بن تغلق کے عہد (744ھ / 1343ء) میں عباسی منشور دہلی لایا گیا، جس کا مفصل ذکر ضیاء الدین برنی نے کیا ہے۔ سلطان نے نہ صرف عباسی سفیروں کا ننگے پاؤں استقبال کیا، بلکہ حاجی سعید سرسری کے قدم چومے اور خطبۂ جمعہ میں صرف خلیفہ عباسی کا نام شامل کرنے کا حکم دیا۔ (برنی، 1991، ص 700) اسی واقعے کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی کیا ہے۔ اُس کے مطابق، سلطان محمد بن تغلق کی عباسی خاندان سے عقیدت اس قدر مشہور ہو چکی تھی کہ خلیفہ مستنصر باللہ کے پوتے غیاث الدین محمد خود دہلی آئے۔ سلطان نے ان کی شاندار پذیرائی کی، خود رکاب تھامی، پھل پیش کیے اور شاہی اعزازات سے نوازا۔ (ابن بطوطہ، رحلہ ابن بطوطہ، 2000، ص 876–877)

اناطولیہ اور برصغیر ہند—دونوں خطوں کے لیے سب سے شدید تباہی کی لہر ان حملوں سے آئی جو منگولوں نے 13ویں صدی کے وسط میں شروع کیے۔ خصوصاً اناطولیہ میں سلجوقی ترکوں کو 1243ء میں کوسہ داغ کی جنگ میں منگولوں کے ہاتھوں زبردست شکست ہوئی، جس کے بعد منگول اناطولیہ کے بیشتر حصے پر قابض ہو گئے۔ ہندوستان میں بھی منگولوں نے بارہا حملے کیے، تاہم دہلی سلطنت کے ترک سلطان علاء الدین خلجی کی جنگی تیاری، دفاعی پالیسی اور حکمت عملی کی بدولت منگول تباہی یہاں اس شدت سے واقع نہ ہو سکی جس طرح اناطولیہ میں ہوئی۔ علاء الدین نے دہلی کے گرد دفاعی قلعہ بندی، عسکری تنظیم نو اور منگولوں کے خلاف جارحانہ رویہ اپنا کر سلطنت کو عارضی طور پر تباہی سے بچا لیا۔ (عامر، سارے ہندوستان کا متحد ترکی بادشاہ علاء الدین خلجی، انقرہ، 2021، ص 35–40) جب اناطولیہ اور برصغیر دونوں منگول حملوں کے اثرات سے کسی حد تک سنبھلنے لگے، تب ایک اور تباہ کن مرحلہ سامنے آیا—یعنی تیموری حملے۔ چنگیز خان کی نسل سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرنے والے امیر تیمور نے 1398ء میں ہندوستان پر حملہ کرتے ہوئے تغلق خاندان (1320ء–1413ء) کو نیست و نابود کر دیا۔ دہلی شہر میں قتل عام، لوٹ مار اور فتنہ و فساد نے سلطنت کو شدید سیاسی کمزوری کا شکار کر دیا۔ اسی امیر تیمور نے 1402ء میں انقرہ کے مقام پر سلطنتِ عثمانیہ کو بھی بڑی شکست دی، جہاں عثمانی سلطان بایزید یلدرم ان کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ تاہم، عثمانی سلطنت نے قلیل مدت میں سیاسی استحکام بحال کر کے اپنی ساکھ دوبارہ قائم کی، اور بالآخر 1453ء میں فتحِ قسطنطنیہ کے ذریعے ایک عالمی طاقت کی صورت میں اُبھری۔ اس کے برخلاف، برصغیر میں سیاسی انتشار، طاقت کے خلاء، اور داخلی خانہ جنگی کا دور طویل عرصے تک قائم رہا۔ ترک، افغان، سید اور دیگر مقامی قوتیں مسلسل باہم برسرِپیکار رہیں، جس نے سلطنت دہلی کو مزید کمزور کیا۔ بالآخر، امیر تیمور ہی کی نسل سے تعلق رکھنے والے ظہیرالدین محمد بابر نے 1526ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی، جو ہندوستان میں ایک نئی ترک سلطنت کی صورت میں ابھری۔

ظہیرالدین بابر نے 1526ء میں جب صرف 1200 تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا، تو اس کی عسکری قوت میں ایک اہم اضافہ اناطولیہ سے آنے والے ماہرینِ حرب و توپخانہ تھے، جن میں علی قلی اور مصطفیٰ رومی نمایاں نام تھے۔ انہی کی فنی مہارت اور جدید ترک توپ خانے کی بدولت ابراہیم لودھی کی افواج کو پانی پت کی جنگ میں زبردست شکست ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اسی سال، عثمانی سلطنت نے یورپ میں اپنی ایک فیصلہ کن فتح موہاچ کی جنگ میں حاصل کی، جہاں سلطان سلیمان قانونی نے مجار بادشاہ دوم لاجوش کو شکست دے کر ہلاک کر دیا۔ (پیچوی، ابراہیم، تاریخ پیچوی، ج 1، ص 69–75، وزارتِ ثقافت و سیاحت، انقرہ، 1981) یوں ہندوستان اور یورپ دونوں میں ترک سپاہ اور قیادت نے ایک ہی سال میں دو عظیم سلطنتوں کو ختم کر کے اپنی نئی حکومتوں کی بنیاد رکھی — مجار سلطنت، عثمانیوں کے ماتحت ایک صوبہ بنی، اور ہندوستان میں مغلیہ ترک سلطنت کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں، جب ہمایوں کی وفات دہلی میں واقع ہوئی، تو سلطنت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے، دہلی میں موجود عثمانی امیر البحر اور کپتان دریا سیدی علی رئیس کے مشورے پر یہ خبر خفیہ رکھی گئی، اور تین روز تک معمول کے مطابق دربار لگایا جاتا رہا تاکہ شہزادہ اکبر تک یہ خبر بروقت اور سیاسی تدبر کے ساتھ پہنچائی جا سکے۔ اس واقعے کی تفصیلات خود سیدی علی رئیس نے اپنی مشہور سفرنامہ مراۃ الممالک میں بیان کی ہیں، جہاں وہ شہزادہ اکبر سے لاہور میں ملاقات اور تعزیت کا ذکر کرتے ہیں۔ (سیدی علی رئیس، مراۃ الممالک؛ اردو ترجمہ: حافظ عامر علی – زیرِ اشاعت) سیدی علی رئیس کے مطابق، اس عمل کی مثال عثمانی وزیر اعظم پیری محمد پاشا سے لی گئی تھی، جس نے سلطان سلیم یاوز کے انتقال کی خبر اس وقت تک خفیہ رکھی جب تک شہزادہ سلیمان قانونی استنبول پہنچ کر تخت پر متمکن نہ ہو گیا۔ ترک-مغلیہ سرکاری تعلقات کا باقاعدہ آغاز اگرچہ بابر کے عہد سے عسکری و فکری سطح پر ہو چکا تھا، لیکن باضابطہ سفارتی روابط کی بنیاد بعد میں پڑی۔ 1608ء میں ایک شخص حاجی اکم، جو خود کو عثمانی سلطنت کا سفیر ظاہر کرتا تھا، شہنشاہ جہانگیر کے

دربار آگرہ میں پیش ہوا۔ تاہم جہانگیر نے اس کی سفارتی اسناد کو مشکوک قرار دے کر اسے دربار سے فوراً نکال دیا۔ اس واقعے کا ذکر تزکِ جہانگیری میں تفصیل سے ملتا ہے، جہاں بادشاہ واضح کرتا ہے: "چونکہ امیر تیمور کے حملے کے بعد کبھی بھی کوئی سرکاری وفد عثمانی سلطنت کی طرف سے نہیں آیا، اس لیے میں نے اس شخص پر اعتماد نہیں کیا" (جہانگیری، تزک جہانگیری، ص: 115، اردو ترجمہ: اقبال حسین، دہلی: کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2019) یہ بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ اگرچہ دونوں مسلم طاقتیں — عثمانی سلطنت اور مغلیہ سلطنت — ایک مشترکہ تہذیبی و دینی شناخت رکھتی تھیں، لیکن رسمی سفارتی تعلقات کی ابتدا قدرے تاخیر سے ہوئی، جس کی ایک بڑی وجہ جغرافیائی فاصلہ اور صفویوں کے خلاف ترجیحی توجہ بھی تھی۔ دونوں ریاستوں کے درمیان پہلا معتبر اور باضابطہ سفارتی رابطہ 1636ء میں قائم ہوا، جب شاہ جہاں نے عثمانی سلطان مراد چہارم کو ایک رسمی خط ارسال کیا۔ اس خط کے پس منظر میں صفوی سلطنت کے خلاف ممکنہ عسکری اتحاد اور عقیدتی ہم آہنگی کی کوشش نمایاں تھی، کیونکہ دونوں ریاستیں صفویوں کو مشترکہ سیاسی و مذہبی خطرہ سمجھتی تھیں۔

4- تاریخی و روحانی روابط: صوفیائے کرام، تجار و علماء

برصغیر اور اناطولیہ کے درمیان جس طرح سیاسی روابط کی ایک طویل روایت موجود رہی ہے، اسی طرح دونوں خطوں کے درمیان تجارتی، علمی اور صوفیانہ تعلقات بھی نمایاں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ان تعلقات کی جھلک ہمیں نہ صرف سلطنتی سطح پر ملتی ہے بلکہ عوامی سطح پر بھی اہلِ علم، تجار، اور صوفیہ کے ذریعے ان تعلقات کو فروغ حاصل رہا۔ مشہور ترک مؤرخ مرحوم خلیل انلجیک نے بورصہ کے قاضی دفاتر میں محفوظ عدالتی دستاویزات کی بنیاد پر یہ انکشاف کیا ہے کہ سلطان محمد فاتح کے عہدِ حکومت کے آخری برسوں میں جنوبی ہندوستان کی مسلم ریاست بہمنی سلطنت کے جلیل القدر وزیر محمود گاوان نے کچھ قیمتی ہندوستانی مصنوعات — بالخصوص کپڑے، مصالحے اور رنگ — تجارتی ایجنٹوں کے توسط سے بورصہ کے بازاروں میں بھجوائے۔ (انلجیک، خلیل، دولت عالیہ عثمانیہ، ص 124، ایش بنک، استنول 2021ء) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عثمانی-برصغیر تجارتی تعلقات نہ صرف حکومتی سطح پر قائم تھے بلکہ ذاتی اور عوامی سطح پر بھی پروان چڑھتے رہے۔ ان روابط کی ایک نہایت روحانی مثال صوفی بزرگ شیخ شرف پانی پتی کی مولانا جلال الدین رومی اور شمس تبریزی سے ملاقات ہے۔ بیان کیا گیا ہےکہ چالیس برس کی عمر میں دہلی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کی زیارت کے بعد، آپ پر جذبۂ الٰہی کا اس قدر غلبہ ہوا کہ آپ نے تمام علمی کتب کو پانی میں بہا دیا اور سلوک و سیاحت کی راہ اختیار کی۔ اس سفرِ روحانی کے دوران آپ روم (قونیہ) پہنچے اور غالباً 1244ء تا 1247ء کے درمیانی عرصہ میں شمس تبریزی اور مولانا رومی سے ملاقات کی — جو اس وقت قونیہ میں ایک ساتھ قیام پذیر تھے۔ شمس و رومی کی مجلس میں آپ نے اپنی بقیہ کتب بھی پانی میں بہا دیں اور کئی برس سیاحت کے بعد واپس پانی پت تشریف لائے جہاں آپ کا وصال ہوا۔ علامہ ابوالفضل نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف آئینِ اکبری میں شیخ شرف پانی پتی کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف ان کی روحانی زندگی اور علم دوستی پر روشنی ڈالی ہے بلکہ برصغیر و روم کے علمی و روحانی تعلقات کو بھی اجاگر کیا ہے (ابوالفضل، آئینِ اکبری، ج 2، ص 334)۔ ابتدائی مولوی اور جلالی درویشانہ کتب میں بھی ہمیں اناطولیہ اور برصغیر کے درمیان آمد و رفت اور روحانی تعلقات کے مختلف شواہد ملتے ہیں۔ مثلاً دادا احمد افلاکی نے اپنی تصنیف مناقب العارفین میں ایک ہندوستانی تاجر اور مولانا رومی کے مرید شرف الدین ہندی کا ذکر کیا ہے، جو مولانا کی اہلیہ قراء خاتون کے ہاتھ میں چند ہندوستانی تازہ پھول دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا تھا (افلاکی، مناقب العارفین، ترکی ترجمہ: تحسین یجزی، ص 124–125)۔ اسی طرح خواجہ مجید الدین مراغی کے ایک مرید نے مولانا کو ہندوستانی ٹوپی، ہندی واسکٹ اور بعض دیگر سوغات پیش کیں (افلاکی، ص 233)۔ یہ تمام واقعات اس تاریخی حقیقت کے شاہد ہیں کہ برصغیر اور اناطولیہ کے درمیان تعلق صرف سیاسی یا تجارتی نہ تھا، بلکہ ان کی جڑیں روحانی و فکری میدان تک پھیلی ہوئی تھیں، اور ان تعلقات نے دونوں خطوں کی تہذیبی شناخت کو مضبوط بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

جس طرح برصغیر اور اناطولیہ کے درمیان تعلقات، تجارت، مذہب، فقہ اور صوفی سلسلوں میں گہری مماثلتیں موجود رہی ہیں، اسی طرح ان دونوں خطوں کو درپیش تاریخی مصائب اور آزمائشوں میں بھی نمایاں طور پر اشتراک دکھائی دیتا ہے۔ دونوں خطے نہ صرف تہذیبی و فکری اعتبار سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہے، بلکہ ان پر نازل ہونے والے سیاسی زوال اور نوآبادیاتی یلغار بھی ایک جیسے تھے۔ 1857ء میں جب برصغیر میں انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کیا، تو اس سے صرف ایک برس قبل عثمانی سلطنت بھی اندرونی و بیرونی دباؤ کا شکار ہو چکی تھی۔ 1856ء میں یورپی طاقتوں کے شدید دباؤ کے تحت سلطنتِ عثمانیہ نے "فرمانِ اصلاحات" جاری کیا، جس کے ذریعے تمام رعایا — مسلم و غیر مسلم — کو یکساں شہری حقوق دیے گئے۔ اگرچہ اس فرمان کا مقصد مغرب کو مطمئن کرنا تھا، لیکن اس کے اثرات داخلی طور پر خلافت کے اقتدار اور سماجی ڈھانچے کو کمزور کرنے کا سبب بنے۔ پہلے فرمان تنظیمات (1839) اور اب فرمان اصلاحات کے ذریعے عثمانی خلافت اپنی بنیاد فکر، اسلوب سے دور ہو گئی اور آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی جانب بڑھنے لگی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے مغل سلطنت کے خاتمے کے بعد اپنے لیے ایک نیا روحانی مرکز تلاش کیا اور سلطنتِ عثمانیہ کے خلیفہ کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کر لیا۔ یہ صرف مذہبی وابستگی نہیں بلکہ ایک نفسیاتی اور تہذیبی شناخت کا بھی اظہار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب عثمانیوں پر بلقان کی جنگ (1912–1913) یا بعد ازاں جنگِ عظیم اوّل (1914–1918) کے دوران تباہی کے بادل منڈلانے لگے، تو برصغیر کے مسلمانوں نے دل و جان سے خلافتِ عثمانیہ کی حمایت کی۔ تحریکِ خلافت اور چندہ خلافت جیسے عملی اقدامات اسی وابستگی کا مظہر تھے۔ ان باتوں کا تفصیلی ذکر ہمیں عبدالرحمن پیشاوری کے ان خطوط میں ملتا ہے جو انہوں

نے استنبول سے اپنی ہمیشرہ کو تحریر کیے تھے۔ اس اشتراکِ مصائب نے دونوں خطوں کے اہلِ دانش، شعرا اور مفکرین کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا، اور یوں عاکف اور اقبال جیسے صاحبانِ بصیرت مفکرین نے امتِ مسلمہ کے احیاء کے لیے ایک متحد فکری لائحہ عمل پیش کیا — جو مذہب، اخلاق، علم، عمل، وحدت اور خودی جیسے تصورات پر استوار تھا۔

5- مہمت عاکف اور علامہ اقبال: ایک فکری تقابل

جب ہم برصغیر اور اناطولیہ کے تاریخی، سیاسی، علمی اور روحانی روابط کا عمیق مطالعہ مکمل کر لیتے ہیں تو ہمارے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان خطوں کے فکری افق پر دو عظیم المرتبت شخصیات — محمت عاکف ایرسوئے اور علامہ محمد اقبال — ایسی درخشندہ مثالیں ہیں جنھوں نے اپنی شاعری، نثر اور فکری بصیرت کے ذریعے نہ صرف اپنی اپنی قوم بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کو زوال کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی جانب بلایا۔ ابن خلدون نے "مقدمہ" میں جو تصور پیش کیا کہ "ریاستوں کی عمر بھی انسانی زندگی کی مانند ہوتی ہے — پیدا ہوتی ہیں، جوان ہوتی ہیں، اور پھر ضعف و زوال کے مراحل سے گزرتی ہوئی معدوم ہو جاتی ہیں" — اس کی کامل تطبیق ہمیں ان دونوں شعراء کے تاریخی تناظر میں ملتی ہے۔ جس طرح ایک فرد کی زندگی میں مد و جزر، احوال و تبدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اسی طرح قوموں اور سلطنتوں کے ادوار بھی عروج، زوال، اور احیاء کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے آغاز میں جب عالمِ اسلام عمومی طور پر، اور بالخصوص ترک اور ہندوستانی مسلمان سیاسی و فکری زوال کے نرغے میں آ چکے تھے — جہاں ایک طرف سلطنتِ عثمانیہ پر سامراجی یلغار ہو رہی تھی، دوسری طرف برصغیر کے مسلمانوں نے مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور انگریزی استعمار کی غلامی کو بھگتا — ایسے پُرآشوب دور میں عاکف اور اقبال کی صورت میں دو ایسے فکری داعی ابھرے جنھوں نے اپنی زبان، قلم، جذبہ اور حکمت سے امتِ مسلمہ کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی سعی کی۔ ان کی شاعری صرف حسنِ بیان یا جمالیاتی اظہار تک محدود نہ تھی، بلکہ ایک زندہ فلسفۂ حیات، تعمیری تنقید، اور تجدیدی پیغام پر مشتمل تھی — ایک ایسا فکری منشور جو زوال کے اندھیرے میں امت کے لیے روشن مینار بن گیا۔ اب ہم اگلے پیراگراف میں ان دونوں مفکرین کے پیش کردہ بحران سے نجات کے عملی راستوں — علم و عمل، اتحاد، خودی، اخلاق اور روحانی احیاء — کا تقابلی جائزہ پیش کریں گے، تاکہ ان کی فکری روشنی سے آج کے دورِ غبار آلود میں راہ پانے کی کوئی سبیل ہو سکے۔

اناطولیہ اور برصغیر کے درمیان تاریخی، روحانی اور سیاسی روابط کی روشنی میں جب ہم مہمت عاکف ایرسوئے اور ڈاکٹر محمد اقبال کے افکار کا مطالعہ کرتے ہیں تو محض دو جغرافیائی خطوں کی فکری ہم آہنگی نہیں، بلکہ ایک مشترکہ روحانی اضطراب اور فکری جدوجہد بھی سامنے آتی ہے۔ یہ وہ عہد تھا جب پوری مسلم دنیا زوال، شکست، استعماری غلامی اور فکری پراگندگی کے دور سے گزر رہی تھی۔ تاہم عاکف اور اقبال نے اس تاریک دور میں شعور کی مشعل جلائے رکھی اور امت کے لیے حکمت، عمل اور امید کا پیغام دیا۔ وہ صرف شاعر نہیں تھے، بلکہ اپنے اپنے معاشروں کے دردمند نباض اور بصیرت افروز مفکر بھی تھے جنھوں نے زوال کی گہرائی میں بصیرت کا چراغ روشن کیا۔

مہمت عاکف ایرسوئے کی پوری زندگی — 1873ء سے 1936ء تک — دراصل خلافتِ عثمانیہ کے زوال اور جدید ترک قومیت کے ظہور کا عینی مشاہدہ ہے۔ 1923ء میں خلافت کے خاتمے اور مصطفیٰ کمال کی اصلاحات کے بعد عاکف نے ایک ایسے ماحول میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی جو اُن کے روحانی و تہذیبی نظریات سے متصادم تھا۔ ان دنوں کو وہ خود "بسمل پرندہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کا کلام محض تخیل کی پرواز نہیں بلکہ حقیقت کی تلخ تصویریں ہیں، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں

Hayır, hayâl ile yoktur benim alış verişim...

İnan ki: Her ne demişsem görüp de söylemişim.

Şudur cihanda benim en beğendiğim meslek:

Sözüm odun gibi olsun; hakîkat olsun tek!

نہیں، تخیل سے میرا کوئی واسطہ نہیں

یقین کرو! جو کچھ بھی کہا، وہ دیکھ کر کہا

دنیا میں میرے نزدیک سب سے پسندیدہ پیشہ یہی ہے:

میری بات لکڑی کی مانند ہو — مگر ہو سراسر سچ

(ارسوئے، مہمت عاکف، صفحات, ص 86)

اسی طرح اقبال نے بھی مغرب کے سیاسی غلبے اور مشرق کے فکری جمود کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے مشاہدات صرف ہند و ایران تک محدود نہیں تھے، بلکہ وہ دمشق، بخارا، بغداد، قاہرہ اور قونیہ جیسے مراکزِ علم و روحانیت کی گرتی ہوئی دیواروں کو محسوس کر رہے تھے۔ اقبال کے لیے مسلم امت کی وحدت ایک دینی فریضہ تھی، اور ان کی شاعری میں وقت کا الم اور اصلاح کی صدا باہم جُڑے نظر آتے ہیں:

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر میرا نہ دِلّی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات، سمجھتا ہوں جسے حق

نہ اَبلہِ مسجد ہُوں، نہ تہذیب کا فرزند

اقبال کے ان اشعار میں شرق و غرب کی تقسیم سے ماورا ایک آفاقی مسلم تشخص کی تمنا جھلکتی ہے۔ وہ عالمِ اسلام کے فکری زوال پر ایک بلند فکر، مصلح اور عمل انگیز شاعر کی حیثیت سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔

6- زوال کے دور میں امید، خودی اور اخلاق کی صدا

اقبال اور عاکف دونوں اس بات پر متفق تھے کہ کسی قوم کی نجات کا راستہ علم، محنت اور اعلیٰ اخلاقیات سے ہو کر گزرتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوام جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو سب سے پہلے وہ اپنے ذہین، بیدار مغز اور باکردار افراد سے محروم ہو جاتی ہیں۔ خلیل جبران کے بقول، "زوال پذیر قومیں اپنے اہلِ عقل کو تابوتوں میں دفن کر دیتی ہیں"۔ عاکف اور اقبال نے اسی نکتے کو اپنی قوم کے سامنے بار بار بیان کیا — کہ محض ماضی پر فخر، یا جذباتی خطابت کافی نہیں؛ ضرورت ہے علم، تحقیق، اصول پسندی اور عمل کی۔

اقبال اپنی قوم کو صداقت، عدالت اور شجاعت کا سبق پڑھاتے ہوئے یوں کہتے ہیں

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور جب وہ مغرب کی علمی میراث پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے پیچھے چھپی اسلامی وراثت کی یاد دہانی یوں کرواتے ہیں:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

دوسری طرف مہمت عاکف ایرسوئے کی نظم عاصم ان کی شاعری کے آخری اور سب سے فکری حصوں میں سے ہے۔ یہ نظم ایک خیالی کردار عاصم کے گرد گھومتی ہے، جو ترک نوجوان کی ایک آئیڈیل (مثالی) شخصیت ہے: دیندار لیکن دقیانوس نہیں محبِ وطن لیکن نسل پرست نہیں جدید علوم میں ماہر لیکن مغرب زدہ نہیں شجاع، بااخلاق، علم دوست اور باعمل مہمت عاکف اس نظم میں ایک ایسے نوجوان کی تشکیل کرتے ہیں جو امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ (دوبارہ بیداری) کا علمبردار ہو سکتا ہے۔ عاصم صرف ایک شخص کا نام نہیں بلکہ پوری نسل کے لیے مثالی نمونہ ہے

Bu cihetten, hani, hiç yılmasın, oğlum, gözünüz;

Sâde Garb'ın, yalınız ilmine dönsün yüzünüz.

O çocuklarla beraber, gece gündüz, didinin;

Giden üç yüz senelik ilmi sık elden edinin.

Fen diyarında sızan nâ-mütenâhî pınarı,

Hem için, hem getirin yurda o nâfi' suları.

Aynı menba'ları ihyâ için artık burada,

Kafanız işlesin, oğlum, kanal olsun arada

اس پہلو سے، بیٹے، تمہاری نگاہیں کبھی نہ جھکیں،

بس مغرب کے صرف علم کی طرف تمہارا چہرہ ہو

ان (یعنی مغرب کے) بچوں کے ساتھ، دن رات محنت کرو

جو تین سو سال سے علم چھن چکا ہے، وہ دوبارہ مضبوطی سے حاصل کرو

سائنس کے دیار سے جو بے شمار چشمے بہہ رہے ہیں

اُن کو خود بھی پیو، اور ان نفع بخش پانیوں کو وطن بھی لاؤ

انہی چشموں کو یہاں زندہ کرنے کے لیے

تمہارا ذہن کام کرے، بیٹے، اور تم ایک علمی نہر بنو جو ان کو جوڑ دے

(ایرسوئے، صفحات، ص 373)

عاصم" نظم، مہمت عاکف کی سب سے زیادہ فکری اور اصلاحی نظم ہے، جس میں وہ ترک نوجوان کو ایک علمی، دینی اور عملی ماڈل کے طور پر تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نظم مہمت عاکف کا اُس مسلمان نوجوان سے مکالمہ ہے جو یورپ کی سائنسی ترقی سے فائدہ اُٹھا کر، اپنی تہذیب و دین کی بنیادوں پر ایک نئی فکری عمارت تعمیر کرے۔ عاکف کے نزدیک زوال کا مقابلہ نہ صرف جذبات بلکہ علم، حکمت اور خودی کے ذریعے ممکن ہے۔ عاصم کی نسل وہ نسل ہے جو قرآن سے الہام لے کر، سائنس و تحقیق سے جڑ کر، دینی حمیت کے ساتھ عالمی قیادت کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ اشعار صرف نصیحت نہیں بلکہ ایک فکری تحریک کی بنیاد ہیں — ایک ایسی تحریک جو ماضی پرستی، کاہلی، اور توہم پرستی سے نکل کر عمل، تدبر اور ترقی کی جانب لے جاتی ہے۔

7- عصرِ حاضر میں افکارِ عاکف و اقبال کی معنویت

جب کوئی قوم داخلی زبوں حالی اور بیرونی یلغار کی دہری ضرب سے دوچار ہو، جب تہذیبی ضعف، فکری انارکی، اور سیاسی زوال اسے پہچان کے بحران میں مبتلا کر دے، تو ایسی گھمبیر صورتِ حال میں وحدتِ امت، علم و اخلاق، اور شعور و حکمت کی بنیاد پر ازسرِ نو بیداری ہی وہ واحد راستہ بچتا ہے جو زوال کی کھائی سے نکل کر تجدیدِ احوال کی طرف لے جاتا ہے۔ مہمت عاکف ایرسوئے اور علامہ محمد اقبال کی فکری کاوشیں اسی تناظر میں دیکھنی چاہییں۔ ان دونوں مفکرین نے اپنے اپنے زمانے میں مسلم معاشروں کو انہی خطوط پر دعوتِ اصلاح دی — ایسی دعوت جو محض زبانی یا شاعرانہ نہیں، بلکہ عمل، فہم، بصیرت اور ایمان سے لبریز تھی۔ مہمت عاکف ایرسوئے نے خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب پر گہری نظر رکھتے ہوئے نہایت دردمندی سے اس امر کی نشان دہی کی کہ مغربی طاقتوں نے عثمانی سلطنت کے زیر سایہ رہنے والی اقوام کو نسلی، لسانی اور علاقائی بنیادوں پر تقسیم کر کے ان میں اختلاف، تعصب اور بغاوت کے بیج بو دیے۔ ترک، عرب، کرد، ارناؤت، چرکس — سب ایک ہی جسم کے اعضا تھے جنہیں علیحدگی کی خنجر سے کاٹ کر باہم دشمن بنا دیا گیا۔ اس سانحے پر عاکف کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ کہتے ہیں

Aynı milliyetin altında tutan İslam'ı

Temelinden yıkacak zelzele kavmiyettir

Bunu bir lâhza unutmak ebedî heybettir

Arnavutlukla, Araplıkla bu millet yürümez

Son siyaset ise Türklük, o siyaset yürümez

اسلام ہی ہے جو مختلف قوموں کو ایک ملت کے جھنڈے تلے جمع رکھتا ہے۔

لیکن نسل پرستی ایک زلزلہ ہے جو اس ملت کی بنیادوں کو ہلا دے گا۔

اس بات کو ایک لمحے کے لیے بھی بھول جانا، ابدی ذلت و رسوائی کا باعث بنے گا۔

صرف ارناؤت ہونا یا عرب ہونا اس ملت کو آگے نہیں لے جا سکتا۔

اور اگر آخری سیاسی نظریہ ترک قوم پرستی ہے، تو وہ بھی ناکام ہو گا۔

اسی معنی کے بیان کرنے والی صفحات کی تیسری کتاب میں موجود "حق کی آواز" کے عنوان سے بیان کردہ نظم میں وہ کہتے ہیں

اے غلامی کے مارے ہوئے لوگو، کہاں گئی تمہاری خودمختاری؟

مجھے تو ڈر ہے کہ اب تمہارا نصیب بس ہمیشہ کی ذلت رہ گئی ہے۔

یتیم و بے سہارا خاندانوں سے کوئی ذبح ہونے چلا جائے،

اور کوئی ہزاروں قسم کی مصیبتوں میں جا گرے۔

کسی کی عزت پامال ہو، اور کسی کا خون مباح سمجھا جائے۔

اے بغاوت کے عنصر، یہ ہے تمہاری دردناک بربادی!

تجھے اُکسایا چند نادانوں نے — یہ اُن کا کمال ہے؟

اور تُو اس ذلت انگیز انجام کی توقع کیوں نہ رکھتا تھا؟

کہاں گئی وہ بات کہ تمہاری قومیت اسلام ہے؟ تو پھر یہ قوم پرستی کیا ہے؟

تمہیں تو اسلام ہی کے دامن سے لپٹے رہنا چاہیے تھا!

"ارناؤت ہونا" کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا شریعت میں اس کی کوئی گنجائش ہے؟

اپنی قوم کو دوسروں پر فوقیت دینا — یہ کفر ہے، کچھ اور نہیں۔

کیا عرب کو ترک پر، لاز کو چرکس یا کرد پر،

اور عجم کو چینی پر کوئی فوقیت ہے؟ کہاں؟

اسلام میں تو قوموں کا کوئی وجود ہی نہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ خود قوم پرستی کے تصور پر لعنت بھیجتے ہیں!

(ایرسوئے، صفحات، 165)

ان اشعار میں عاکف نہ صرف ایک سچے دردمند مفکر کی حیثیت سے بولتے ہیں، بلکہ ایک سچے مؤمن کی طرح امتِ واحدہ کا تصور اجاگر کرتے ہیں، جو نبی آخرالزماں ﷺ کی تعلیمات کی روح ہے۔

علامہ اقبال بھی اسی حقیقت پر زور دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ مغربی قوم پرستی — جو نسل، زبان، وطن یا رنگ کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم کرتی ہے — اسلام کے تصورِ امت سے متصادم ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رُسولِ ہاشمی

اُن کی جمعیّت کا ہے مُلک و نسَب پر انحصار

قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھُوٹا تو جمعیّت کہاں

اور جمعیّت ہوئی رُخصت تو مِلّت بھی گئی

یہ اشعار نہ صرف وحدتِ امت کا نوحہ ہیں بلکہ اس کا نسخۂ شفا بھی ہیں۔ عاکف اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے انداز میں مسلم اقوام کو یہ باور کرایا کہ اسلام کی اصل روح، ان کی نجات کا واحد راستہ، ان کا تشخص، اور ان کی عزت — سب کا مرکز "وحدت" ہے۔ یہ پیراگراف دونوں مفکرین کی امت پرستی، وحدتِ اسلامی کی تڑپ، اور قوم پرستی کے رد کا ایک روشن باب ہے،

جو موجودہ دور کے انتشار زدہ مسلم معاشروں کے لیے نہایت اہم پیغام رکھتا ہے۔ اقبال اور عاکف دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ اسلامی دنیا کی نجات "وحدت" میں ہے — وہ وحدت جو نبی کریم ﷺ کے پیغام کا جوہر ہے، جو فرقہ واریت، نسل پرستی اور قوم پرستی کی ہر دیوار کو گرا کر ایک "امتِ واحدہ" کی تشکیل کا داعیہ رکھتی ہے۔ آج جب مسلم دنیا ایک بار پھر فکری، تہذیبی اور سیاسی انتشار کا شکار ہے، تو عاکف اور اقبال کا یہ پیغام پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان دونوں مفکرین کی شاعری محض جمالیاتی کلام نہیں بلکہ عملی بصیرت، روحانی بینائی اور اجتماعی بیداری کی دستاویز ہے۔

اقبال اور مہمت عاکف ایرسوئے دونوں نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ ان کے ممالک کی سیاسی شکست، سماجی افراتفری، مذہبی انتشار اور اخلاقی زوال کا زمانہ تھا۔ مگر ان دونوں شعرا و مفکرین نے ان تاریک حالات کو صرف بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنی شاعری اور فکری پیغام کے ذریعے ایک نئی روح پھونکنے کی سعی کی۔ انہوں نے مایوس قوموں میں امید، شکست خوردہ ذہنوں میں حوصلہ، اور بکھری ملت میں اتحاد کی فضا پیدا کرنے کے لیے نظم و نثر دونوں کا سہارا لیا۔ مہمت عاکف کے سامنے ترک قوم کا وہ منظر تھا جہاں خلافت ختم ہو چکی تھی، ملک ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا، اور دشمن اندر و باہر سے حملہ آور تھے۔ اناطولیہ پر قابض غیر ملکی افواج نہ صرف عسکری برتری رکھتی تھیں بلکہ تہذیبی و فکری جارحیت کے ساتھ بھی جلوہ گر تھیں۔ عاکف نے اپنی قوم کو ان دشمنوں کے چہروں کی رنگت، زبانوں کے اختلاف اور مذہب کے فرق کے باوجود ایک ہی وصف — درندگی اور وحشت — میں مشترک بتایا:

Çehreler başka, lisanlar, deriler rengarenk.

Sade bir hadise var ortada : Vahşetler denk.

Kimi Hindu, kimi Yamyam, kimi bilmem ne bela...

Hani tauna da zuldür bu rezil istila

چہرے مختلف، زبانیں مختلف، جلدوں کے رنگ جدا

مگر وحشت سب میں برابر — یہ صرف درندگی کا مظاہرہ ہے

کوئی ہندو، کوئی آدم خور، کوئی انجان آفت

طاعون کے لیے بھی یہ حملہ ذلت کا باعث ہے۔

لیکن اس کے باوجود عاکف نے نہ تو خود حوصلہ ہارا، نہ ہی ترک قوم کو مایوس ہونے دیا۔ انہوں نے "نسلِ عاصم" کا تصور دے کر ترک نوجوان کو اس صحابی رسول ﷺ عاصم بن ثابتؓ کی مثال دی جو اپنے ایمان، عزت اور آزادی کی حفاظت کے لیے جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا:

Şühedâ gövdesi, bir baksana, dağlar, taşlar...

O, rükû olmasa, dünyâda eğilmez başlar,

Yaralanmış temiz alnından, uzanmış yatıyor;

Bir hilâl uğruna, yâ Rab, ne güneşler batıyor!

Ey, bu topraklar için toprağa düşmüş, asker!

Gökten ecdâd inerek öpse o pâk alnı değer.

Ne büyüksün ki kanın kurtarıyor Tevhîd’i...

Bedr’in arslanları ancak, bu kadar şanlı idi...

اے شہداء کے اجسام! ذرا ان پہاڑوں اور پتھروں کو تو دیکھو

اگر رکوع نہ ہوتا تو یہ سر کبھی نہ جھکتے

زخمی پیشانی کے ساتھ وہ آرام کر رہے ہیں

اے رب! ایک ہلال کی خاطر کتنے سورج غروب ہو چکے

اے اس خاک کے لیے خاک میں مل جانے والے سپاہی

تیرے پاک ماتھے کو بوسہ دینے کو اجداد آسمان سے اتر آئیں

تیری عظمت کیا کم ہے کہ تیرا خون توحید کی حفاظت کر رہا ہے

بدر کے شیروں جیسی ہی شان تمہاری ہے۔

اسی طرح، اقبال نے بھی اپنے کلام میں عمل پیہم، خودی، اور امید کا پیغام بار بار دیا۔ وہ مایوسی کو کفر سمجھتے تھے، اور نوجوان نسل کو امت کی نئی صبح کا پیامبر تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ مشہور شعر اسی کیفیت کا نچوڑ ہے:

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی

8- اقبال و عاکف کی فکر میں تربیتِ ملت کا تصور

اقبال کے ہاں نوجوان محض مستقبل کے معمار نہیں بلکہ حال کے استاد بھی ہیں، وہ چاہتے تھے کہ نوجوان صرف علم و ہنر ہی نہیں بلکہ فکری قیادت میں بھی پیری و مرشدی کا منصب سنبھالے

خِرد کو غلامی سے آزاد کر

جوانوں کو پِیروں کا استاد کر

عاکف اور اقبال کا یہ جذبہ دراصل ان کی دینی بصیرت، تاریخی شعور، اور قومی محبت کا مظہر تھا — انہوں نے صرف الفاظ سے نہیں بلکہ افکار سے نئی نسل کو وہ روشنی دی جو تاریکیوں کے سمندر میں رہنمائی کا چراغ بن گئی۔

مہمت عاکف ایرسوئے نے "نسلِ عاصم" اور "جذبہ عاصم" کے تصورات کو ابھار کر ترک قوم کے مورال کو بلند کرنے اور پست ہوتے ہوئے حوصلے کو پھر سے تازہ دم کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے وہ اناطولیہ کے طول و عرض میں مساجد، مدارس اور عوامی مجالس میں وعظ و تقریر کے ذریعے متحرک رہے، جبکہ مختلف رسائل و جرائد میں اپنے اشعار کے ذریعے ایک فکری تحریک کی بنیاد ڈالی۔ تاہم عاکف کو اس امر کا بخوبی شعور تھا کہ صرف جذبۂ ایمانی یا جوشِ ملی کے بل بوتے پر یہ اعصاب شکن معرکہ سر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے "عزم کے ساتھ حکمت" اور "جذبے کے ساتھ علم" کو لازم و ملزوم قرار دیا۔

عاکف نے علم کی ضرورت اور اس کے اسلامی تناظر میں مقام کو یوں واضح کی

“Doğrudan doğruya Kur’an’dan alıp ilhamı,

Asrın idrakine söyletmeliyiz İslam’ı!

Bu dava, şarkı ile olmaz, ilim lazımdır.

Bu kadar heyecanlı adam görmüyorum, varsa göster!”

ہمیں براہ راست قرآن سے الہام لینا چاہیے،

اور اسلام کو عصرِ حاضر کی فہم کے مطابق سمجھانا چاہیے۔

یہ مسئلہ صرف گیتوں یا نعرہ بازی سے حل نہیں ہوگا — علم ضروری ہے!

مجھے ایسا پُرجوش اور باشعور آدمی دکھائی نہیں دیتا — اگر ہے، تو دکھاؤ!

عاکف نے ترک نوجوانوں کو سادہ جذباتیت کے بجائے جدید سائنس، ٹیکنالوجی اور تحقیقی علوم میں مہارت حاصل کرنے کی تلقین کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ ان سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ اپنی تہذیبی شناخت اور روحانی سرمائے سے وابستگی کو ہرگز نہ چھوڑیں۔

اسی طرح علامہ اقبال بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کے دور کا مسلمان نوجوان نہ ماضی پرستی کا شکار ہو اور نہ ہی مغرب زدگی میں اپنی تہذیب و تمدن کو فراموش کرے۔ وہ اپنے شعری تمثیلات کے ذریعے بار بار اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ مغربی علوم کا حصول تبھی مفید ہے جب اس کے ساتھ اسلامی جوہر محفوظ رہے۔ وہ طنزاً فرماتے ہیں:

میں بھی حاضر تھا وہاں، ضبطِ سخن کر نہ سکا

حق سے جب حضرتِ مُلا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے، الٰہی! میری تقصیر معاف

خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت!

اقبال کی نظر میں مغرب سے متاثر ہو کر اگر مشرق اپنی خودی اور ایمان کھو دے تو وہ صرف جسمانی طور پر ترقی یافتہ، مگر روحانی طور پر بانجھ ہو جائے گا۔ اس لیے وہ نصیحت کرتے ہیں:

جوہر میں ہو لا الٰہ، تو کیا خوف

تعلیم ہو گو فرنگیانہ!

دونوں مفکرین کے نزدیک تہذیب کا تصور صرف مادی ترقی پر مبنی نہیں، بلکہ اس میں روحانیت، اخلاق، ادب اور حیا جیسے عناصر بھی شامل ہیں۔ مہمت عاکف یورپی تہذیب کے ننگے پن اور اخلاقی انحطاط پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

Kim demiş Avrupa insanı medeni?

Ne edep var, ne haya, çırılçıplak bedeni!

Eğer medeniyet açıp saçmaksa bedeni;

Desenize hayvanlar bizden daha medeni!

کون کہتا ہے کہ یورپی انسان مہذب ہے؟

نہ ادب ہے، نہ حیا — برہنہ جسم ہے!

اگر تہذیب کا مطلب جسم کو ننگا کرنا ہے،

تو کہہ دو کہ جانور ہم سے زیادہ مہذب ہیں!

اقبال بھی اپنے مرشد رومی کی زبانی یہی نکتہ پیش کرتے ہیں، جب "پیرِ رومی، مریدِ ہندی" کے مکالمے میں وہ مغرب کے ظاہری جاذبے اور اندرونی خالی پن پر روشنی ڈالتے ہیں:

ہے نگاہِ خاوراں مسحورِ غرب

حورِ جنت سے ہے خوشتر حورِ غرب

اور پیر رومی کے منہ سے سنتے ہیں:

چاندی ہے زر بھی، خوب ہے رنگت میں لیکن

سچ یہ ہے کہ داغ ہے دامانِ سفید پر!

یہ اشعار واضح کرتے ہیں کہ مہمت عاکف اور اقبال کے نزدیک اصل ترقی وہی ہے جو روحانی بنیادوں پر استوار ہو، جس میں کردار، علم، تہذیب، اور اسلامی شعور ساتھ ساتھ چلیں — نہ کہ وہ ترقی جو جسم تو سنوارے، مگر روح کو تباہ کر دے۔

جہاں دیدہ مہمت عاکف ایرسوئے اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ صرف ماضی سے وابستگی اور فرسودہ روایات سے چمٹے رہنے سے کوئی عملی راہ نہیں نکلتی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ روایتی مذہبی طبقے کے جمود کو چیلنج کریں گے، تو اُنہیں مخالفت، طعن و تشنیع اور شدید ردِعمل کا سامنا بھی کرنا پڑے گا—خصوصاً اُن افراد کی طرف سے جو مذہب کو محض رسوم و قیود میں قید دیکھنا چاہتے ہیں۔ عاکف ایک ایسے دین کی تعبیر کے خواہاں تھے جو حقیقت کے قریب ہو، نہ کہ افسانوی حکایات

اور من گھڑت تعبیرات سے آلودہ۔ جیسا کہ احسان فضل اوغلو نے بجا طور پر کہا ہے: "عاکف کے نزدیک اسلام کو عصری سیاق میں زندہ اور مؤثر بنانے کے لیے عقل و علم ناگزیر ہیں، اور محض جذبہ یا ماضی پرستی کافی نہیں" ۔ یوسف کپلن جیسے ناقدین، اگرچہ عاکف کے اس رجحان کو مذہبی فکر سے مادیت کی طرف ایک خطرناک جھکاؤ کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عاکف کی فکر دراصل اس توازن کی تلاش تھی جہاں مذہب، جدید علوم، معاشرتی حقیقت اور روحانی اخلاقیات سب ایک مربوط نظام میں مل کر قوم کی رہنمائی کریں۔ وہ ان شعرا و دانشوروں میں سے تھے جنہوں نے نہ صرف تنقید کی، بلکہ تعمیر کا راستہ بھی دکھایا۔ انہوں نے مذہب کو جمود سے نکال کر حرکت، حکمت اور بصیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال بھی اسی نظریاتی محاذ پر سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بھی مذہب محض ماضی پرستی یا تقلیدی روایت کا نام نہیں تھا، بلکہ ایک متحرک روحانی نظام تھا جو انسان کو خودی، کردار، علم اور اجتماعیت کے ذریعے دنیا میں اپنے قدم جمانے کی قوت عطا کرتا ہے۔

نتیجہ

مہمت عاکف ایرسوئے اور علامہ محمد اقبال کے فکری اشتراکات کا مطالعہ ہمیں صرف دو ممتاز شعرا کی فکری جہات سے روشناس نہیں کرواتا، بلکہ برصغیر اور اناطولیہ کے مسلمانوں کے ماضی، حال اور ممکنہ مستقبل کے درمیان ایک فکری پل بھی قائم کرتا ہے۔ ان دونوں مفکرین نے اپنی قوم کو درپیش زوال، پستی، غلامی اور فکری بحران کو محض تنقیدی زاویے سے نہیں دیکھا، بلکہ اصلاح و تجدید کی واضح اور قابلِ عمل راہیں متعین کیں۔ عاکف نے خلافتِ عثمانیہ کے انحطاط، ترک معاشرے کی روحانی بے سمتی، اور مغرب زدہ سیاسی جبر کے ماحول میں قرآن و سنت کی طرف واپسی، علم، حکمت اور قومی غیرت کو نجات کا راستہ قرار دیا۔ اسی طرح اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے خودی، عمل، اتحاد اور تجدیدِ فکر کی دعوت دی۔ ان دونوں شعرا نے قوم پرستی، فرقہ بندی اور ماضی پرستی کو ملتِ اسلامیہ کے لیے زہرِ ہلاہل قرار دیا اور امتِ واحدہ کی تشکیل کو اپنا نصب العین بنایا۔ دونوں نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا، اپنے زمانے کے معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات کو جانچا، اور اپنی شاعری کے ذریعے نئی نسل کو نہ صرف حوصلہ دیا، بلکہ عملی حکمت سے آراستہ کیا۔ ان کے افکار آج بھی مسلم دنیا کے لیے روشنی کا مینار بن سکتے ہیں — بشرطیکہ ہم ان کے پیغام کو صرف تقریری اسلوب تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنی تعلیمی، فکری اور سیاسی پالیسیوں کا حصہ بنائیں۔ درحقیقت، عاکف اور اقبال ہمارے ماضی کے آئینے ہی نہیں، ہمارے مستقبل کی ممکنہ جہتوں کے نقشہ بردار بھی ہیں۔ ان کی فکری میراث محض ادبی یا فلسفیانہ سرمایہ نہیں، بلکہ امتِ مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے عملی حکمت اور روحانی قوت کی علامت ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اس فکری ورثے کو نئے تناظر میں پڑھا جائے، اس پر سنجیدگی سے تحقیق ہو، اور اسے مسلم معاشروں میں تعلیمی و فکری بنیاد کا حصہ بنایا جائے — تاکہ ایک مرتبہ پھر علم، اتحاد، ایمان اور بصیرت پر مبنی امت ابھر سکے۔

ماخذ و مصادر کی فہرست

ابن اثیر، عز الدین، *الکامل فی التاریخ*، بیروت: دارالکتب العلمیہ، 1998ء۔

ابن بیبی، *تاریخ سلاجقہ روم*، انقرہ: ترک تاریخ ادارہ، 1996ء۔

ابن بطوطہ، *رحلہ ابن بطوطہ*، بیروت: دار صادر، 2000ء۔

البخاری، محمد بن اسماعیل، *الصحیح*، قاہرہ: مکتبہ سلطانیہ، 1311ھ

افلاکی، احمد، *مناقب العارفین*، ترکی ترجمہ: تحسین یجزی، انقرہ: ترک تاریخ ادارہ، 1974ء۔

اقبال، محمد، *کلیات* ، اشاعت اول، اقبال اکادمی، لاہور، 1990ء۔

الطبرانی، سلیمان بن احمد، *المعجم الکبیر* ، قاہرہ: مکتبہ ابن تیمیہ، 2006ء۔

برنی، ضیاء الدین، *تاریخ فیروز شاہی*، مترجم: سید معین الحق، لاہور: اردو سائنس بورڈ، 1991ء۔

جہانگیر، نورالدین، *تزک جہانگیری*، اردو ترجمہ: اقبال حسین، دہلی: کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2019ء۔

فرشتہ، محمد قاسم، *تاریخ فرشتہ*، مترجم: عبدالحی، لاہور: المیزان پبلشرز، 2008ء۔

شاہ، ابو الاعلیٰ مودودی، *اسلام کا نظام خلافت*، لاہور، 1345ھ

علامی، ابوالفضل، *آئین اکبری*، اردو ترجمہ: محمد فدا علی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2015ء۔

علی، حافظ عامر، *سولویں صدی میں عثمانیوں اور مغلوں کا غیر مسلم رعایا کے ساتھ تعلقات کا تقابلی جائزہ*، غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ، 2023ء۔

علی، حافظ عامر، *سارے ہندوستان کا ترک بادشاہ: علاء الدین خلجی*، انقرہ، 2021ء۔

نظامی، محمد، *تاریخ سلطنت دہلی*، 1387ھ

Beyhaqī, Abū al-Fazl. *Tārīkh-e Beyhaqī*, Tehran: Dāneshgāh-e Tehrān.

Ersoy, Mehmet Akif. *Safahat*, ed. by D. Mehmet Doğan, İstanbul: Bağcılar Belediyesi, 2014.

İnalcık, Halil. *Devlet-i Aliyye: Osmanlı İmparatorluğu Üzerine Araştırmalar*, İstanbul: İş Bankası Kültür Yayınları, 2021.

Kara, İhsan Fazlıoğlu. *Düşünce Tarihinde İslamî Ufuklar*, İstanbul: Ketebe Yayınları, 2011.

Kaplan, Yusuf. *Mehmet Akif ve Medeniyet Tasavvuru*, İstanbul: İnsan Yayınları, 2014.

Peçevi, İbrahim. *Peçevi Tarihi*, Cilt 1, Ankara: Kültür Bakanlığı Yayınları, 1981.

Turan, Osman. *Selçuklular Zamanında Türkiye*, İstanbul: Ötüken Neşriyat, 2010.

Uzunçarşılı, İsmail Hakkı. *Osmanlı Tarihi*, Ankara: Türk Tarih Kurumu.

Öztürk, M. Nihat. "Abbasiler ile Selçuklular Arasında Dini ve Siyasi Münasebetler", *Selçuk Üniversitesi Türkiyat Araştırmaları Dergisi*, Sayı 24, 2008.